

دیوان غالب

از

میرزا اسد اللہ خان غالب

غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا؟ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
کاؤ کاؤ سخت جانہائے تنہائی، نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتش زیر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا



جراحت تحفہ ، الماس ارمغان ، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد ، غمخوار جان درد مند آیا



جز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روئے کار
آشتی نے نقش سویدا کیا درست
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی
صحرا مگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیکن یہی کہ رفت، گیا اور بود تھا
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوئلن ، اسد!
سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا



کہتے ہونہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
دوستدار دشمن ہے، اعتماد دل معلوم!
سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
غنج پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
حال دل نہیں معلوم۔ لیکن اس قدر یعنی
دل کہاں کہ گم کچے ہم نے مدعا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
آپ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
حسن و تغافل میں جرأت آزما پایا
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا چاہا

شورِ پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟



دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
دل میں ذوق وصل و یادیاں رتک باقی نہیں
آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں، رونہ غافل! بارہا
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
عرض کچے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں؟
میری آہ آتشیں سے بالِ غنقا جل گیا
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا



شوق ، ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب
بوئے گل ، نالہ دل ، دود چراغ محفل
دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد
اے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند!
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
تیر بھی سینہ نعل سے پر افشاں نکلا
جو تری بزم نکلا سو پریشاں نکلا
کام یاروں کا بہ قدر لب و دندان نکلا
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں بھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا



دھمکی میں مر گیا جو، نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگور میں جلوہ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی؟
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نور تھا

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



شمارِ سبجہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا
تماشائے بی یک کف بردن صد دل ، پسند آیا
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل ، پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہرِ قاتل
کہ اندازِ بہ خوں غلتیدن لعل پسند آیا



دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
سبزہ خط خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کچے
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
یہ زمرہ بھی حریف دمِ افعی نہ ہوا
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
گر نفسِ جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا
گوشِ منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا



ستائش گر ہے زہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
بیان کیا کیجیے بیداد کاوش ہاے مڑگاں کا
نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورتِ خرابی کی
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر!
خمش میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا
کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیمتاں کا
مرا ہر داغِ دل اک تخم؛ ہے سرو چراغاں کا
کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شہنمستاں کا
ہیو لی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دھقاں کا
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
چراغِ مردہ ہیں میں بے زباں، گورغریباں کا
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
سبب کیا، خواب میں آکر، تبسم ہاے پنہاں کا؟
قیامت ہے سرِ شکِ آلودہ ہونا تیری مڑگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا ، غالب

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا



نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجہٗ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا



سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی ! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریاے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا



محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا
رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
تو اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا، وگرنہ میں
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
کاوش کا، دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
تاراجِ کاوشِ غم ہجراں ہوا ، اسدا!
سینہ کہ تھا دغینہ گہر ہاے راز کا



بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
شب ہوئی، پھر انجم رخشنده کا منظر کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
کو نہ سمجھوں اس کی باتیں، کو نہ پاؤں اس کا بھید
بے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
کیوں اندھیری ہے شب غم، بے بلاؤں کا نزول
کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
رکھو یارب یہ درِ گنجینہ گوہر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
خلد کا اک در میری گور کے اندر کھلا
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدہ اختر کھلا
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ برا کثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا



شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہٴ ابر آب تھا
واں کرم کو عذر بارش تھا عنان گیر خرام
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
جلوہٴ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو،
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو،
یاں نفس کرتا تھا روشن، شمع بزم بیخودی
فرش سے تاعرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
شعلہٴ جوالہ ہر اک حلقہٴ گرداب تھا
گریے سے یاں پہنہٴ بالَش کفِ سیلاب تھا
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
یاں رواں مژگاں چشمِ تر سے خون تاب تھا
واں وہ فرقِ نازِ محوِ بالَش کنجواب تھا
جلوہٴ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا
یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونِ نابہ پُکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا



نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا تھا سپند بزم وصلِ غیر، گو بیت تاب تھا
مقدم سیلاب سے دل کیا نشاطِ آہنگ ہے خانہ عاشق، مگر سازِ صداے آب تھا
نازش ایام خاکستر نشینی، کیا کہوں پہلوے اندیشہ وقف بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا نظرِ رصد میں اک دیدہ بے خواب تھا

میں نے روکا راتِ غالب کو، وگرنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مرگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو توڑا جو نے آئینہ ، تمثالِ دار تھا
گلیوں میں میری نغش کو کھینچے پھرو، کہ میں جاں دادہ ہوائے سرِ رنگوار تھا
موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ہر ذرہ ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبِ دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو ، پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا



بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
وایے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھے کو
جلوہ ، از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط
عشرت پارۂ دل ، زخمِ تمنا کھانا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے تو بہ
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاہاں ہونا
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مرگاں ہونا
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
لذت ریشِ جگر ، غرقِ نمکداں ہونا
ہاے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

حیف اس چارہ گرہ کپڑے کی قسمت غالب!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا



شبِ خمارشوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیطِ بادہ صورتِ خانہ خمیازہ تھا
یک قدمِ وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشتِ خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ خانہٴ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن دستِ مرہونِ حنا، رخسارِ رہنِ غارہ تھا

نالہٴ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا



دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور، کب تلک
حضرت ناصح گرامتیں، دیدہ و دل فرس راہ
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھایوں سہی
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا
ہم کہیں گے حال دل، اور آپ فرمائیں گے کیا
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟



یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
ترے وعدے پر جیسے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
تری ناز کی ہے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرے ہمیشہ کو
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
غم اگر چہ جاں گسل ہے، پہنچن کہاں کہ دل ہے!
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
ہوے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا

اور اگر جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا؟
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
مجھے برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
نہ کبھی جنازہ اٹھتے، نہ کہیں مزار ہوتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟
نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکین آزما کیا
فروغِ شعلہٴ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموس وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دل ہر قطرہ ہے سازِ ”انا للہ“ ہم اس کے ہیں ، ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے ، میں ضامن ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خونہا کیا
سن اے غارت گر جنسِ وفا ، سن شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدہٴ صبر آزما کیوں؟ یہ کافرِ فتنہٴ طاقت رُبا کیا؟

بلاے جاں ہے غالبِ اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا؟



درخوِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں، کہ ہم
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خواہاں
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خونِ باب
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
اٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
رو برو، کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا



اسد ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں کہ ہے سر پنجہ مرگانِ آہو پشت خارا پنا



پے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا بہ خوں غلتیدہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حسن دے، اے جلوہ بینش، کہ مہر آسا چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم غافل! تیری گردن پر رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا
تمناے زباں محو سپاس بے زبانی کا مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا
وہی اکبات ہے جو یاں نفس واں نکبت گل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نے دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے

کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا



گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
زہرہ گرا ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب
لے تو لوں، سوتے میں اس کے پانو کا بوسہ مگر
دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
باغ میں مجھ کو نہ لے جاوے میرے حال پر
وے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
بے تکلف، داغِ مہر دہاں ہو جائے گا
پر تو مہتابِ سیل خانماں ہو جائے گا
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہربان ہو جائے گا
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا
ہر گل تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ ، آخر تو بھی دانا ہے اسد

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا



درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا ، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
بے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا ، لہو نہ تھما کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ داستانی ہے؟ لے کے دل ، داستانی روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا



گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
دل اس کو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد

جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا



قطرہ مے بسکہ حیرت نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر، رشتہ گوہر ہوا
اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا



جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا تپش شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا
اہل بینش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا
نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون ، غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا



میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیز جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا



گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر درخ بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا



نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا ، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا



یک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایام کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشہ فکر سخن مجھے تریا کی قدیم ہوں دود چراغ کا
سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل
ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا!



وہ مری چینِ جہیں سے غم پنہاں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آمینہ ہنوز
شرح اسبابِ گرفتاری خاطر مت پوچھ
بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
سفرِ عشق میں ضعف نے راحتِ طلبی
تھا گریزاں مژدہ یار سے دل تا دمِ مرگ
رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریبان سمجھا
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا
نبضِ خس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا
ہر قدم سارے کو میں اپنے شبتاں سمجھا
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار ، اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا



پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل ، جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا ، یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
عذر واماندگی ، اے حسرت دل ! نالہ کرتا تھا ، جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگور یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأت فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ ، مگر ، یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا



ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں؟
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کیجا ٹھنڈا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آپ آتے تھے، مگر کوئی عنایاں گیر بھی تھا
اس میں کچھ شبابہ خوبی تقدیر بھی تھا
کبھی فتراک میں تیرے کوئی خنجر بھی تھا
ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقدیر بھی تھا
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
نالہ کرتا تھا، ولے طالب تاثیر بھی تھا
ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ جوانمیر بھی تھا
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رتختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا



لب خشک در تشنگی مردگان کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردهاں کا
ہمہ ناامیدی ، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگان کا



تو دوست کسی کا بھی ، ستمگر ! نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ قضا نے
توفیق بہ اندازہٴ ہمت ہے ازل سے
جب تک نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں سادہ دل ، آزر دگی یار سے خوش ہوں
دریاے معاصی تکِ آبی سے ہوا خشک
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
خورشیدِ ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
میں معتقدِ فتنہٴ محشر نہ ہوا تھا
یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدِ داغِ جگر سے مرے تحصیل

آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا



شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا رشتہ ہو شمعِ خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جواگتی ہے حنا کس قدر یاربِ ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا

کیا کروں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل ، بے منت کیموس تھا



آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا



عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرت ، ہستی لیے ہوئے ہوں شمع کشتہ ، درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
بر روے شش جہت در آئینہ باز ہے یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا ، کر دیے ہیں شوق نے بند نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہیں ستم ہاے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفامٹ گئی کہ واں حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسدا!

جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا



رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
ذره ذره ساغرِ مے خانہ نیرنگ ہے
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازش اربابِ عجز
گردشِ مجنوں بہ چشمِ کہاے لیلیٰ آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دل وحشی کہ ہے
ذره ، صحرا دستگاہ و قطرہ ، دریا آشنا
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہِ سنخ رشکِ ہمدِ گیر نہ رہنا چاہیے
میرا زانوِ مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا ، اسد

سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا



ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
درِ دِل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
عرش سے ادھر ہوتا، کاشکے، مکاں اپنا
بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں، اپنا
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
تنگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبِ دشمن آسماں اپنا



سرمۂ مفت نظر ہوں ، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا



غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانہ صبا نہیں طرہ گیاد کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ صیدِ ز دام جستہ ہے اس رامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا



جور سے باز آئے ، پر باز آئیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
موج خوں سر سے گزر رہی کیوں نہ جائے
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
آستِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟
مر گئے پر ، دیکھیے دکھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا



لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن ز نگار ہے آئینہ بارِ بہاری کا
حریف جوش دریا نہیں خود داری ساحل
جہاں ساقی ہو تو ، باطل ہے دعوٰی ہوشیاری کا



عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری صورت قفل ابجد
دل ہو کشمکش چارہ زحمت میں تمام
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
دل سے مناتری انگشتِ حنائی کا خیال
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
گر نہیں نکھت گل کو ترے کوچے کی ہوس
تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
کیوں ہے گر درہ جولان صبا ہو جانا
دیکھ برسات میں سبز آنے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ، ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا



پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن
جو ہوا غرقہ مے بخت رسا رکھتا ہے
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
بار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو،
جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنہ ناز
بسکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو ہو کر
موجہ گل سے چراغاں ہے گزر گاہ خیال
نشے کے پردے میں ہے جو تماشا دماغ
ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل
شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موسم گل!

دے بٹ مے کو دل و دست شنا موج شراب
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
سر سے گزرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب
موج گل موج شفق موج صب، موج شراب
دے ہے تسکین بہ دم آب بقا موج شراب
شہپر رنگ سے ہے باک کشا موج شراب
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب
موجہ سبزہ نوخیز سے تا موج شراب
رہبر قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موج شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ ، اسد

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب



افسوس کہ دنیاں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انشت
کافی ہے نشانی ہے تری ، چلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقت سفر انشت
لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انشت



رہا گر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے ، عشق خونباہ مشرب لکھے ہے : خداوند نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشاے نیرنگ صورت سلامت



مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے ، پر کس وقت



آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
اے دلِ نا عاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
عشق میں بیدارِ شک غیر نے مارا مجھے
چشمِ ماروِشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دو دِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست
کشتہ دشمن ہوں آخر، گر چہ تھا بیمارِ دوست
دیدۂ پر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرستش اس کے ہجر میں
 تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
 جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ
 چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
 مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجیے؟
 بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست
 مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست
 سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست
 ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست
 یا بیان کچے سپاس لذت آزار دوست؟

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
 ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست



گلشن میں بندوبست بہ رنگ و گر ہے آج
قمری کا طوق حلقہ بیرون در ہے آج
آتا ہے ایک پارہ دل ہر نغان کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر ، اے انتظام چل
سیلاب گریہ در پے دیوار و در ہے آج



لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو میجا کا کیا علاج!



نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں ، انتظارِ ساغر کھینچ
کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ بہ رنگ خار مرے آنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانہ راحت ہے انتظار اے دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے، بہ حسرت، نظارہ نرگس بہ کوریِ دل و چشم رقیب ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز نیام پردہ زخم جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صباے آتش پنہاں
بہ روے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ



حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
منصبِ شیفنگی کے کوئی قابل نہیں رہا
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
خوں ہے دل، خاک میں احوال بتاں پر یعنی
درخورِ عرّس نہیں جوہر بیداد کو جا
ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش و داع
کون ہوتا ہے حریف مرے مردِ افکن عشق
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
بارے، آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
شعلہٗ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
نگہٗ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد



بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
فورا شک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نوید مقدم یار
ہوئی کس قدر ارزانی مے جلوہ
جو ہے تجھے سر سوداے انتظار تو آ
ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں، تو سائے سے
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے، گھر کی آبادی
نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب

نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار
کہ گر پڑے نہ مرے پائوں پر در و دیوار
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
کہ ناچتے ہیں پڑے، سر بسر، در و دیوار

نہ کہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں

حریف رازِ محبت ، مگر در و دیوار



گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگر نہ ہم
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا التفات

جانے گا اب بھی تو، نہ مرا گھر کہے بغیر؟
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
سر جائے یار ہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
بنی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر



کیوں جل گیا نہ تاب رخ یاد دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا
آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ خن کے ساتھ
زنار باندھ ، سبھ صد دانہ توڑ ڈال
ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی ، نہ طور پر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
سرگرم نالہ ہاے شرر بار دیکھ کر
رکتا ہوں ، تم کو بے سبب آزاد دیکھ کر
مرتہا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر
ہم کو حریص لذتِ آزاد دیکھ کر
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر



میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاہاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
بہم گِ رِ صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ عنوان پر
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
قیامت اک ہواے تند ہے خاک شہیداں پر

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے
فراغت کسی قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا
مجھے اب، دیکھ کر ابر شفق آلودہ، یاد آیا
بجز پروازِ شوق ناز کیا باقی رہا ہو گا

نہ لڑنا ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی؟

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!



ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مرے بات
امرو سے ہے کیا اس نلکہ ناز کو پیوند
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سراڑ جائے
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھے کوزباں اور
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
لے آئیں گے بازار سے، جا کر دل و جاں اور
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
ہوتے جو کئی دیدہ خونباہ فشاں اور
جلا د کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ”ہاں اور“
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و نغاں اور
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور



صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگِ آخر
تغیر آبِ بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیرِ وحشت کی
ہوا جامِ زمرہ بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ عریانی
بہ رنگ کاغذ آتش زدہ ، نیرنگ بیتابی
فلک سے ہم عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
گر یہاں پاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک پیدن پر
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم زوزن پر
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسد بمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
”تو مشق ناز کر ، خون دو عالم میری گردن پر“



ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواہاں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
مت جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
آئے ہوکل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
تم کون سے تھے ایسے کھرے دادِ دستدے!
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور



فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز
ہے ناز مفلسان زیرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروش شوخی داغ کفن ہنوز
مے خانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز



حریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز دعا قبول ہو یا رب ، کہ عمر خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ ، بیاباں نورد وہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجئے آئینہ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعت مے خانہ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز



وسعت سعی کرم دیکھ کر سر تا سر خاک
گزرے ہے ابلہ پا ابر گھر بار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحہٴ دشت
نقش پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز



کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا ، پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیرکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
تو اور آرایشِ خم کا گل
لافِ تمکلیں ، فریبِ سادہ دلی
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
اے ترا غمزہ ، یک قلمِ انگیز
تو ہوا جلوہ گر ، مبارک ہو
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
میں اور اندیشہ ہاے دورِ دراز
ہم ہیں اور راز ہاے سینہ گداز
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
جس سے مژگاں ہوینہ ہو گل باز
اے ترا ظلم ، سر بسر انداز
ریشِ سجدۂ جبینِ نیاز
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رند شاہد باز



مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
جگر تھنہ آزاد تسلی نہ ہوا
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
میں بھی رک رک کے نہ مرنے، جو زباں کے بدلے
دہن شیریں میں جا بیٹھے لیکن اے دل
دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو، کرتا ہے
دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
نہ کھڑے ہو جے خو، بان دل کے آزار کے پاس
خود بخود پنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی، ہے ہے !

بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس



نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے
لگاوے خانہ آئینہ میں روے نگارِ آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے ، نکالے گر نہ خارِ آتش



جادہ راہ خور کو دقت شام ہے تارِ شعاع
چرخِ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع



رخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
زبانِ اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ، قصہ تمام
غم اس کو حسرت پر وانہ کا ہے اے شعلہ!
ترے خیال سے روح اہتر از کرتی ہے
نشاطِ داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
ہوئی ہے آتش گل، آبِ زندگانی شمع
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
بطرزِ اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع
ترے لرز نے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانِ شمع
شگفتگی ہے شہید گل خزانِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع



ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبور ، یاں تک ہوے اے اختیار حیف
جتنا ہے دل کہ کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے
اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف



زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک
گردِ راہ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
چھوڑ کر جانا تنِ مجروح عاشق، حیف ہے
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پے توفیرِ درد
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
نالہٴ بلبل کا درد اور خندہٴ گل کا نمک
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجہٴ دریا نمک
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جانمک
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
زخمِ مثلِ خندہٴ قاتل ہے سرتا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چٹتا تھا نمک



آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقہ مہد کام نہنگ
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
پرتو خور سے ہے شبِ نیم کو فنا کی تعلیم
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا آسد کس سے ہو جز مرگِ علاج
شع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک



گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ



ہے کس ہلاک فریب و فائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہوائے گل
جو تھا سومو ج رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالہ! لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو رکھتا ہو مثلِ سایہٴ گل سر بہ پائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے میناے بے شراب و دل بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل درقنائے گل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیبِ قباے گل



غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم
ہیں چراغانِ شبتانِ دلِ پروانہ ہم
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمت مردانہ ہم
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترک جستجو

دائمِ الحسب اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جاننے ہیں سینہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم



بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاع خانہ زنجیر ، جز صداء معلوم!



مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیچو میرے دعویٰ وارتگی کی شرم



لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں



وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے ذوق نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا شورِ سوداے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب و ہ رعنائی خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں



کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
پاے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
اک شر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
کہتے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
قبلے کو اہل نظر قبلہ بما کہتے ہیں
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفۃ نوا ، کہتے ہیں



آہر و کیا خاک اس گل کی گلشن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
زخم سلوانے سے مجھ پر پارہ جوئی کا ہے طعن
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
قطرہ قطرہ اک ہیولی ہے نئے ناسور کا
لے گئی ساقی کی نخوتِ قلمِ آشامی مری
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

ہے گریبانِ ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
رنگ ہو کراڑ گیا، جو خوں کے دامن میں نہیں
ڈرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
انجمن بے شمع ہے، گر برقِ خرمن میں نہیں
غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخم سوزن میں نہیں
جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشیتِ خس کہ گلخن میں نہیں



عہدے سے مدح ناز کے، باہر نہ آسکا گراک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے ! خدا نہ کردہ ، تجھے بیوفا کہوں



مہرباں ہو کے بلا لو مجھے ، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ، ستمگر ! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟



ہم سے کھل جاؤ بے وقت مے پرستی ایک دن
غمرہ اونچ بنائے عالم امکاں نہ ہو
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانے
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن



ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
ہم کو ستمِ عزیز ، ستمگر کو ہم عزیز
بوسہ نہیں ، نہ دیکھیے دشنام ہی سہی
ہر چند جاں گدازیِ قہر و غتاب ہے
جانِ مطربِ ترانہِ ہل من مزید ہے
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
ہے نگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
نقصاں نہیں جنوں میں ، بلا سے ہو گھر خراب
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
تا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں عزیز
آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں
لب پر وہ سنخِ زمزمہِ الاماں نہیں
دل میں چھری چھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
سو گز میں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
گویا جبین پہ سجدۂ بت کا نشان نہیں
روح القدس اگر چہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہاے بوسے ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں



مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے
رنگ نومیدی جاوید؛ گوارا رہو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں
لذت سنگ بہ اندازہ تقریر نہیں
کوئی تفصیر بجز خجالت تفصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقد میر نہیں“



مت مردک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سوید اے دل چشم میں آہیں



برِ شِکالِ گریہِ عاشق ہے ، دیکھا چاہیے
کھل گئی مانند گلِ سو جا سے دیوارِ چمن
الفِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارتگی
مرد ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن



عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں
سلطنت دست بہ دست آئی ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتو خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردش رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومی جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں



جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دل آشفترگاں خالِ کنجِ دہن کے سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا ! کہ اے محورِ آمینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے کہ شبرو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں



کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خراب میں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا

ق

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ امرو شبِ ماہتاب میں



کل کے لیے کر آج نہ حسرت شراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
رد میں ہے رخس عمر، کہاں دیکھیے تھمے
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
اصلِ شہود و شاہد و مشہور ایک ہے
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر
شرم اک ادا ہے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
گروہ صداسمانی ہے چنگ و رباب میں
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
پیشِ نظر ہے آئینہ داتم نقاب میں
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبِ ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگی بو تراب میں



حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیڑوں جگر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
ہے کیا جو کس کے باندھے، میری بلا ڈرے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک تیز رو کے ساتھ
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوے یار
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دھر کا

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گھر کو میں



ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
وعدہ سیر گلستاں ہے، خوشا طالع شوق
شہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں قیامت میں تمہیں
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو
صاف دردی کش پیانہ جم ہیں ہم لوگ
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
وای وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں



نالہ جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہ خسرو، کیا خوب
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب
و اے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
نفی سے کرتی ہے اثباتِ تراوشِ گویا
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
ہے تقاضاے جفا، شکوہ بیداد نہیں
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا نہیں
لطمہ موجِ کم از سیلی استاد نہیں
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
گر چراغانِ سرِ رنگور باد نہیں
مژدہ! اے مرغ، کہ گلزار میں صیاد نہیں
دی ہے جاے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں؟



دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غنخوار کیا کریں



ہوگئی غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں



قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آتا
تعجب سے وہ بولا: ”یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟“
دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر مرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں



دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رنگدار بادیاں



یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آنیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہر طرف کلمہ کو کیا دیکھیں

ہم اوج طالعِ لعل و گھر کو دیکھتے ہیں



نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبانہ کہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام!

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو جاؤں واں سے کہیں تو خیر باد نہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
گداے کوچہٴ مے خانہ نامراد نہیں
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں



تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
نشہ رنگ سے ہے واشد گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی واماندگیاں! آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خواب ، غالب
ہم سے بیان وفا باندھتے ہیں



زمانہ سخت کم آزار ہے ، بہ جان اسد
وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں



دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہگار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے لعل و زمر و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں



خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلِ خواں ہو گئیں
جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں
میری آپہں بخینہ چاک گریباں ہو گئیں
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں
ماتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

سب کہاں، کچھ لالہ و گل نمایاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگِ بزمِ آرایاں
تھیں بناتِ اعش گردوں، دن کو پردے میں نہاں
قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زناں مصر سے
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ بے شامِ فراق
ان پر ی زادوں سے لیس گے خلد میں ہم انتقام
نہیں اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
خاک میں کیا صورتیں ہوگی کہ پنہاں ہو گئیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
ہوا ہے تارِ اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں



یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
طاقت بہ قدر لذت آزار بھی نہیں
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں
آخر نواے مرغ گرفتار بھی نہیں
حالانکہ طاقتِ خلش خار بھی نہیں
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں
دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سروبال دوش
گنجائشِ عداوت اغیار یک طرف
ڈرنالہ ہاے زار سے میرے، خدا کو مان
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روشنی
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا



نہیں ہے زخم کوئی بچنے کے درخور مرے تن میں
ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
ودایت خانہ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
نکوہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی
ہوئے اس مہر ووش کے جلوہ تمثال کے آگے
نہ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
ہزاروں دل دیے جوش جنونِ عشق نے مجھ کو

ہوا ہے تارِ اشک یا س رشتہ چشم سوزن میں
کف سیلاب باقی ہے بہ رنگِ پنبہ روزن میں
نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کی روزن میں
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
پر افشاں جو ہر آنیے میں، مثل ذرۂ روزن میں
جو گل ہوں تو ہوں گلخس میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسدِ زندانی تاثیر الفت ہائے خواباں ہوں
خیمِ دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں



مزے جہان کے اپنی نظر خاک نہیں
مگر، غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
یہ کس بہشت شاتل کی آمد آمد ہے
بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
وگر نہ تاب و تواں ہاں و پر میں خاک نہیں
کہ غیر جلوۂ گل رنگور میں خاک نہیں
اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے آسہ
کھلا کے فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں



دل ہی تو ہے، نہ سنک و خشت، درو سے بھر نہ آئے کیوں
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں
جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز
دشمنہ غمزہ جاں ستان، ناوک ناز بے پناہ
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
واں وہ غرور عز و ناز، یاں یہ حجاب پاس وضع
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!

روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں
بیٹھے ہیں رنگد زر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
آپ ہی ہوں نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں
جس کو ہودین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا، کیجیے ہاے ہاے کیوں!



غنجہ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا، کہ یوں،
پریش طرز دلبری کیجیے کیا کہ دن کہے
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھیے
بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ نموش بیٹھیے
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تھی
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح؟
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

بو سے کو پوچھتا ہوں میں منہ مجھے بتا، کہ یوں!
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ، یوں!
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں!
سامنے آن بیٹھنا اور دیہ دیکھنا کہ یوں!
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں،
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ، یوں،
موج، مہیط آب میں مارے بے دست و پا کہ یوں،

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی؟

گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں،



حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو
بہ قدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشہ دامن ، گر آب ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد ، گرم خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن ، شکل قمری ، نالہ فرسا ہو



کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
طاعت میں تا، رہے، نہ مے وانگین کی لاگ
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو؟
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رو و رسم ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو



وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلہ
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
ڈالا نہ بکسی نے کسی سے معاملہ
ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال
وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں
موتا ہے فوتِ فرصت ہستی کا غم کوئی؟

کچے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
ہے دل پہ بار، نقش محبت ہی کیوں نہ ہو
ہر چند برسمیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
یوں ہو تو چارہ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
حاصل نہ کچے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو، کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو



مرا ہونا برا کیا ہے نو اسنجان گلشن کو
نہ دی ہوتی خدایا آرزوے دوست، دشمن کو
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مڑگاں سوز کو
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
نہیں دیکھا شناور، جوے خوں میں تیرے تو سن کو
کیا بے تاب کان میں جنبش جوہر نے آہن کو
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی برقِ خرمن کو
مرے بت خانے میں تو کبے میں گاڑو برہمن کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو
رہا کھٹکا نہ چوی کو دعا دیتا ہوں رہزن کو
جلر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ کا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
ہوا چہ چا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سر بار بار آوے
وفاداری بشرط استواری، اصل ایماں ہے
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ جو مجھ کو
نہ لنتادن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جواہر کا؟

مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو



دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤ
دی سادگی سے جان، پڑوں کو بکن کے پاؤ
بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سز ہے یہ
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
اللہ رے ذوق دشت نور دی کے بعد مرگ
ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن سے پاؤ
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پاؤ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤ
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن میں پاؤ
اڑتے ہیں الجھتے ہیں مرغ چمن کے پاؤ
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤ

غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤ



واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی ، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ، ذوق ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدہِ نچیر سے نہ ہو



صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
یہ نگاہِ غلطِ انداز تو سم ہے ہم کو
نالہٴ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو!
پاسِ بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

واں پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دلِ محو و فارکھتا ہے
ضعف سے نقشِ پے مور ہے طوقِ گردن
جان کر کچے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
رشتکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
سراڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، لیکن ناچار
تم وہ نازک کہ خموشی کو نغان کہتے ہو

ق

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو



تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
تم بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
کیا وہ بھی بہ گنہ کش و حق ناشناس ہیں
ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرور نہیں

دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو



گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کچے
تھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
الچتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
بتاؤ اس مژدہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
نہ مانے دیدہ دیدار جو، تو کیونکر ہو
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرد تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبِ ولے بہ قول حضور
”فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو“



نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
سبک سر بن کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا زداں کیوں ہو
تو پھر، اے سنگدل، تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
نہ کھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
ہوے تو دوست جس کے، دشمن اس کا آساں کیوں ہو
عرو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نراسخ فغاں کیوں ہو
وہ اپنی خو، نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
قفس میں مجھ سے رو دا چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
غلط ہے جذب دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
کہا تم نے کہ کیوں غیر کے ملنے میں رسوائی

نکالا چاہتا ہ کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو



رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسہاں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ بیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو



از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئندہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئندہ



ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواری رہ و ستم ہمراہ نہ پوچھ



صد جلوہ رو بہ رو جو مڑگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق یعنی ، ہنوز منتِ طفلان اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردہِ تبسمِ پنہاں اٹھائیے



مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
دے داداے فلک دل حسرت پرست کی
یکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوٰری
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو
ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا
بھوں پاس آنکھ، قبلہ حاجات! چاہیے
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
اک گونہ بجنودی مجھے دن رات چاہیے
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ق

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بخودی روسوے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بہ حسب گردش پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے غالبِ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے



بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزرده ہم چندے تکلف سے
خیال مرگ کب تسکین دل آزرده کو بخشے
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہدم
نہ اتنا برّش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
سورہتا ہے بہ اندازہ چکیدن سرنگوں وہ بھی
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی
کہ ہو گا باعثِ افزائش درد دروں وہ بھی
مرے دریاے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بی
لیے بیٹھا ہے اک دوپار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوہ ہجراں

خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں ، وہ بھی



ہے بزمِ بتاں میں سخنِ آذر وہ لبوں سے تنگ آئے ہے ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدحِ وجہِ پریشانی صہا یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد ز نہار نہ ہوتا طرفِ اب بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربطِ لبوں سے



تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں ، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب تر احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سن کے بلا لیں ، یہ اجارہ نہیں کرتے



گھر میں تا کیا ، کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر ، سو ہے



غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب!
لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا
لکھ کو ب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
ولے مشکل بے حکمت دل میں سو زغم چھپانے کی
اٹھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کو
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
مری طاقت کو ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی



حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھو ، اے آرزو خرامی
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اس کی شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی



کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
کی اس نے گرم، سینہ اہل ہوس میں جا
کیا خوب، تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیور یار میں
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
فرماں رواے کشور ہندوستان ہے
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے



درد سے میرے بے تجھ کو بے قراری ہاے ہاے
تیرے دل میں گرنہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
کیوں مری غمخواری کا تجھ کو آیا تھا خیال
عمر بھر کا تو نے پیانِ وفا باندھا تو کیا
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہواے زندگی
گل نشانی ہاے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
خاک میں ناموسِ پیانِ محبت مل گئی
ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہاے تارِ برشکال
گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال

عشق نے پکڑا نہ تھا ، غالب! ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا ، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ، ہاے ہاے



سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کچے بیاں سرور تب غم کہاں تلک ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ وفا ہر چند اس کے پاس دل حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب اس بلغی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکاں کو ہے کلیں سے شرفِ اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اداس ہے



گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ دل فردِ جمع و خرج زبا نہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آنسو پر دازاے خدا رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے
ہے ہے ! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی؟ اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پر میری عرصہ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے



تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے



ایک جا حرف وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہے وہی بد مستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
مجھ سے مت کہہ: ”تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی“
ظاہر کا غنڈ ترے خط کا غلط بردار ہے
ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتشبار ہے
ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناچار ہے
جس کے جلوے سے زمیں تا آسمان سرشار ہے
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچتی ہے کہ تا
تجھ پر کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے



پنیں میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے



مری ہستی فضاے حیرت آباد تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا، فضل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفاے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمد اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی

کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے



رحم کر ظالم کہ بود چراغ کشته ہے
نبض بیمار وفا دود چراغ کشته ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشته ہے



چشمِ خواباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلہٴ آواز ہے
پیکرِ عشاق ساز طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دستگاہ دیدہ خونبار مجنوں دیکھنا
اب بیاباں جلوہٴ گل فرشِ پا انداز ہے



عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
قطع کچے نہ تعلق ہم سے
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں؟
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

میری وحشت تری شہرت ہی سہی
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
نہ سہی عشق ، مصیبت ہی سہی
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی



ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبح وطن ہے خندہ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس معنی آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال تا ، بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں آنے لگی ہے نکھت گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے



زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!



اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گر چہ عمر خضر
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

بیٹھا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کیے
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے؟
مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے!
تو نے وہ گنج ہائے گرا نمایہ کیا کیے
کس دن ہمارے سر پہ نہ آ رہے چلا کیے
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے



رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
میناے مے ہے سرو نشاط بہار مے بال تد رو جلوہ موج شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے



میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبر جائے ہے
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
پرہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا ندیشے میں ہے
غیر کو یا رب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے
دور چشم بدتری بزم طرب سے واہ واہ
گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
اس کی بزم آرائیاں سن کو دل رنجوریاں
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ کو آتش بجاں کے کس سے ٹھہر جائے ہے!



گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں بحر میں دی بردلیالی نے مجھے
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم کر دیا کافران اصنام خیالی نے مجھے
ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے



کا گاہ ہستی میں لا داغ سماں ہے برق خرمن راحت خونِ گرم دھقاں ہے
غنجِ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم! با وجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشت دستِ عجزِ شعلہ خسِ بدنداں ہے



اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے



سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
رنج رہ کیوں کھینچے واما ندگی کو عشق ہے!
جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی!
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
یہ جواک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے!
فتنہ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے؟

ہے دل شوریدہ غالبِ طلسم و تاج
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے



دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہو سینا ، خوشا لذت فراغ تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں اٹھیے بس اب کہ لذت کو اب سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوے یار میں بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروے شیوۂ اہل نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی



تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنون نے کیا کیا
لازم نہیں کہ خضر کہ ہم پیروی کریں
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ہر شب پیاہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
میرا سلام کہو اگر نامہ بر ملے
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچہ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفۂ سر ملے



کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غم ہاے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کی ، سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلاے آسانی اور ہے
ہو چکیں غالبِ بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے



کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حادل دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

کبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی



دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
 یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
 غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
 نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
 سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
 ام کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے
 ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
 جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
 ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
 اور درویش کی صدا کیا ہے
 جان تم پر نثار کرتا ہوں
 میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
 مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے



کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
ظاہر ہے کہ گھبرا کہ نہ بھاگیں گے نکیرین
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہاں اہل طالب! کون سنے طعنہ نایافت
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر

ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ دوا آئے
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیں میں جو آئے
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے



پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویاے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمد فصل لالہ کاری ہے
قبلہ مقصد نگاہ نیاز پھر وہی پردہ عماری ہے
چشم دلال جنس رسوائی دل خریدار ذوق خواری ہے
وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی وہ صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر محشرستان بے قراری ہے
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے روز بازار جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر کھلا ہے در عدالت باز گرم بازار فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیرا زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارہ جگر نے سوال ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے



جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیاسعی آزادی ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلان ہے
شرار سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی



نکوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی مبادا خندہ دندان نما ہو صبح محشر کی
رگ لیلیٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے اگر بووے بجائے دانہ دھقاں نوک نشتر کی
پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیداد ذوق پر فشانی عرض کیا قدرت کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی



بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
تیری وفا سے کیا ہوتا فانی کہ دھر میں
لکھتے رہے جنوں کی حکایت خوں چکاں
اللہ ری تیری تندی خو جس کے بیم سے
اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو پانہ اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
جو اداں نہ کھچ سکے سو وہیاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے



جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فردگی نہاں ہے بہ کمیں بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی



ظلمت کدے میں میرے شب غم کو جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
نے مژدہ وصال نہ نظارہ جمال مدت ہوئی اکہ آشتی چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے
گوہر کو عشق گردن خواہاں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے!
دیدار بادہ ، حوصلہ ساقی نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل زنہارا اگر تمہیں ہوسِ نائے وِ نوش ہے
 دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحتِ نیوش ہے
 ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزنِ حمکین و ہوش ہے
 یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
 لطفِ خرامِ سقی و ذوقِ صداۓ چنگ یہ جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش ہے
 یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
 داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالبِ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے



آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے طاقت بیداد انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیات دہر کو بدلے نشہ بہ اندازہٴ خمار نہیں ہے
گر یہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہاے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطف جلوہ ہاے معانی غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے واے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے



ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے
رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی سمجھیومت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چکنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے



پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد خار پا ہیں جوہر آئینہ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے
ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے



جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تب ناز گراں مانگی اشک بجا ہے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک
غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
تب چاک گریباں کا مزہ ہے دل نالاں
آتشکدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے
اے واے، اگر معرض اظہار میں آوے
اے واے، اگر معرض اظہار میں آوے
گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے



اس سے میرا مہُ خورشیدِ جمال اچھا ہے
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز

ہم کو معلو ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے



نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی، نہ سہی
خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
مے پرستاں! خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
شوق گلچیں گلستان تسلی نہ سہی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلی نہ سہی
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرت صحبت خواہاں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی



عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی
خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اپنے سارے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
کہ اس کے درپہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجہ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے جو میری جان کی قسم آگے



شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
عشق کی راہ میں ہے چرخ ملکب کی وہ چال
کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد، کہ ہم
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
ست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
آپ اٹھا لاتے ہیں گر نیر خطا ہوتا ہے
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے بار بد بزم سخن
 اے شہنشاہ کو اکب سپہ و مہر علم
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
 تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
 تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
 آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
 یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
 میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
 ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
 آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے



ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
کوئی بتاؤ کہ وہ شرخ تند خو کیا ہے
وگر نہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
کر دیتے ہو جواب را کہ جستجو کیا ہے
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
سوائے بادۂ گلنام مشکبو کیا ہے
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاشکے تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے



غیر لیں محفل میں بو سے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامہ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے



پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطہ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روش سطح چرخ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے چشم نرگس کو دی ہے مینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے باد پینائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی



تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کچے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے



کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزہ خونریز نہ پوچھ دیکھ خونباہ نشانی میری
کیا بیاں کرے مرا روئیں گے یار مگر آشفته بیانی میری
ہوں ز خود رفتہ بیدارے خیال بھول جانا ہے نشانی میری
مقابل ہے مقابل میرا رگ گیا دیکھ روانی میری
قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد باد رہ بیتابی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی چچ میدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالب
تنگ پیری ہے جوانی میری



نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب پائے طاؤس بے خامہ مانی مانگے
تو وہ بدخو تحیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفته بیانی مانگے
وہ تب عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے



گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر یاں نالے کو اور الٹا دعوای رسائی ہے
از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے



جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رنو کی لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عرو کی
اچھا ہے سرانگشتِ حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوندِ لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو خنجر نے کبھی نہ بات پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی



سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دل بیقرار کے
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل ، کہ چلے دن بہار کے



ہے وصل ہجر عالم تمکلیں و ضبط میں
معتوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے



چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحت رنداں سے واجب ہے حذر جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے!
اک مت کر جیب بے ایام گل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خبر برویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے



ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
درس عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں
غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں
اثر آبلہ سے جادۂ صحراے جنوں
بیخودی! بستر تمہید فراغت ہو جو!
شوق دیدار میں گرتو، مجھے گردن مارے
بیکسی ہاے شب ہجر کی وحشت ہے ہے!
گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
ہے نگہ رشتہ شیرازۂ مژگاں مجھ کو
صورت دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
کس قدر خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے!
صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
پر ہے سارے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے
سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے



نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا!
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے



چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے صبح کے مانند زخم دل گریبانی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کچے خیال دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تک آگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے
میکدہ گر چشم مست ناز سے پاوے شکست موے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگانی کرے

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے



وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤ پھول گئے

کہا جو اس نے ” ذرا میرے پاؤ داب تو دے“



تپش سے میری وقف کشاکش ہر تار بستر ہے مرا سر رنج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے
سر شک سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے دل بے دست و پا افتادہ بر خور دار بستر ہے
خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہو
بہ طوفان گاہ جوش اضطراب شام تنہائی شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے
ابھی آتی ہے بوبالش سے اس کی زلف مشکیں کی ہماری دید کو خوب زلیخا عار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر یک تار بستر خار بستر ہے



خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جاوے
غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جاوے
سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے



فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تو بنے گر باغ گداے مے نہیں ہے
ہر چند ایک ہر ایک شے میں تو ہے پر جھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اردی جو نہ ہو تو وے نہیں ہے
کیوں رو قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے ”نہیں ہے!“



نہ پوچھ نسخہ مرہم جراثیم کا
کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے



ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے



کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے
کبھی تو اس دل شوریدہ کی بھی داد ملے کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہاے بلبل زار کہ گوش گل نم شبنم سے پنہ آگیاں ہے

اسد ہے نزع میں چل بے وفا براے خدا

مقام ترک حجاب و وداع تمکین ہے



کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی واے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گل دیکھ روے یارِ داد آیا اسد
جو ششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے



دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
رہے ہے یوں گہو بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرشش حال
تمہیں نہیں سر رشتہ وفا کا خیال
انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے؟
حسد مزائے کمال سخن ہے کیا کچے!

ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے؟
کہ بن کہیے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے
کہ یہ کہے کہ سر رہگور ہے کیا کہیے
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے!

ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے!
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے!

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کہیے



دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے
بن گیا تیغ نگاہ کا یار کا سنگِ فساں
کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے
واے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
وعدہ آنے کا وفا کچے یہ کیا انداز ہے!
ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ!

کر گئی واسیہ تن میری عریانی مجھے
مرحبائیں! کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے
جاننا ہے محو پرش ہاے پنہانی مجھے
لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے
اس قدر ذوق نواے مرغ بستانی مجھے
لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے
تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی درباری مجھے
پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالباً یوسف ثانی مجھے



یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ ”یارب!“ مجھے
ہے کشاد خاطر وابستہ در رہن سخن
سیمہ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے
تھا طلسم قفل ابجد خانہ مکتب مجھے
یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشتہ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاق نرت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھے سے ہو گئے؟
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے



چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے
ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
اسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے
غرض شست بت ناوک فلن کی آزمائش ہے
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہے
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
نسیم مصر کو کیا پیر کنعان کی ہوا خواہی
رہے دل میں تیرا چھا جگر کے پار ہو بہتر
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہو پھر کہ غافل تھے
نہیں کچھ سچہ و زنا ر کے پھندے میں گیرائی
پڑا رہا دل و اسیر بیتابی سے کیا حاصل
رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو

وہ آویں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب رخ کہن کی آزمائش ہے



کبھی نیکی بھی اس کے جی می گرا جائے ہے مجھ سے
خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
سنجھنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
ہوئے ہیں پاتو پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی

جفائیں کر کے اپنی یاد شرمائے ہے مجھ سے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
کہ دامان خیال یا رچھوٹا جائے ہے مجھ سے
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے



ز بسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے
نہ جانوں کیونکہ مئے داغ طعن بدعہدی تجھے کہ آئینہ بھی ورطہ ملامت ہے
بہ بیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ نگاہ عجز سر رشتہ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوای عشق بے بنیاد
جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے



لاغر اتنا ہوں کہ گر بزم میں جادے مجھے میرا ذمہ ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم واں تلک کوئی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ انداز غتاب کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے



باز تپتے اطفال ہے دنیا مرے آگے
اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مر نزدیک
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آراہوں نہ کیوں ہوں
پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
خوش ہوتے ہیں پروصل میں یوں مر نہیں جاتے
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے!

ہم پیشہ و ہم شرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے



کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو کیا کہیے
نہ کہو طعن سے پھر تم کہ ہم شکر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے
وہ نیشتر ہی پر دل میں اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعہٴ راحت جراحات پیرکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
کبھی شکایت رنج گراں نشین کچے
کہیں حکایت صبر گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونبھا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرجھا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے!
روانی روش و مستی ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے!
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!



رونے اور عشق میں بیباک ہو گئے دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرف بہاے مے ہوئے آلات میکشی تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعرش
دشمن جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے



نشہ ہا شاداب رنگ وساز مست طرب
شیشہ مے سر و سبز جوبار نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے



عرض ناز شوخی دنداں براے خندہ ہے دعویٰ جمعیت احباب جاے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل یک جہاں زانو تا مل درقنائے خندہ ہے
کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام ورنہ دنداں درد ل افشردن بنائے خندہ ہے

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل

محیط گریہ و لب آشناے خندہ ہے



حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے
آنہ زانوے فکر اختراع جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن؟
چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے



جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
چاک جگر سے جب رہ پرش نہ وا ہوئی
لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز
ہر سنگ وحشت ہے صدف گوہر شکست
سربر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز
بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی



ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زباں کھلتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ق

نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی
 روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی
 کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
 کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی
 جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
 کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی



بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے؟

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے!



باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہر تیغ بہ سر چشمہ دیگر معلوم! ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر اب اگاتا ہے مجھے
مدعا محو تماشائے شکست دل ہے آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کف خاک آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے



روندی ہوئی ہے کوکہ شہریار کی اترائے کیوں نہ خاک سر رہ گزار کی
جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی



ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
ڈرے کیوں میرا تامل کیا رہے گا اس کی گردن پر
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھریوں دم بہ دم نکلے؟
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے
وہ ہم سے بھی زیادہ حسیتِ تنگ ستم نکلے
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے



کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائے
بے تکلف اے شرار جستہ! کیا ہو جائے
بیضہ آسما، ننگ بال و پر ہے یہی کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائے



مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے موج شراب یک مژہ خوابناک ہے
جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدا!
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے



لب عیسیٰ جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشیہ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے



آمد سیلاب طوفاں صداے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے



ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے



سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی



ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں
خموشی ریشہ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
نگاہ بے حجاب ناز تنغ تیز عریاں ہے
کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دستگرداں ہے
دل و دیں نقد لاساقی سے گرسودا کیا چاہے

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلم صرصر کا مرجاں ہے



خموشی میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے تری سرمہ سائکتی ہے
فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردے میں جائکتی ہے
نہ پوچھ سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے



جس جا نسیم شانہ کش زلگ یار ہے
کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبار شوق
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب
تج آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
بے پردہ سوے وادی مجنوں گزر نہ کر
اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

نافہ دماغ آہوے دشت تار ہے
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے
گر دام یہ ہے وسعت صحرا شکار ہے
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے
وہ آئے یا آئے پہ یاں انتظار ہے
ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے



آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
گلدستہ نگاہ سویدا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرت دیدار سے نہاں
وہ ایک مشت خاک کی صحرا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
صبحِ بہار پنہا مینا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظِ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟



شبم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
دل خوں شدہ کشمکش حسرت دیدار
شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو
مجبوری و دعوای گرفتاری الفت
معلوم ہوا حال شہیدان گزشتہ
اے پرتو خورشید جہاں تاب! ادھر بھی
نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

داغ دل بے درد نظر گاہ حیا ہے
آئینہ بہ دست بت بد مست حنا ہے
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے
آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے
اے نالہ! نشان جگر سوختہ کیا ہے؟
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے
دست تہ سنگ آمدہ بیان وفا ہے
تغ ستم آئینہ تصویر نما ہے
سارے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے



منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بنا وہیں
واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
گوواں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

قسمت کھلی ترے قد وہ رخ سے ظہور کی
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی!
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی



غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلنام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے
ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں؟
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے؟
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکانیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟

شاعر وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے



مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
پھر پرش جراحات دل کو چلا ہے عشق
پھر بھر رہا ہوں خلمہ مژگاں بہ خون دل
باہم گر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
پھر جی می ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے
برسوں ہوئے ہین چاک گریباں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
سازِ چمن طرازی داماں کیے ہوئے
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
جاں نذر دلفریبی عنواں کیے ہوئے
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
سرے سے تیز دشنہ مژگاں کیے ہوئے
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
سر زیر بار منتِ درباں کیے ہوئے
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفان کیے ہوئے



نویدا من ہے بیداد دوست جاں کے لیے
بلا سے! گر مژدہ یار تشنہ خوں ہے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
رہا بلا میں بھی میں مبتلاے آفت رشک
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
گدا سمجھ کو وہ چپ تھ مری جو شامت آئے

رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے
رکھوں کچھ اپنی بھی مرگاں خوں فشاں کے لیے
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
بلاے جان ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسہاں کے لیے!

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگناے غزل
 دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
 زباں پہ بار خدایا! یہ کس کا نام آیا
 نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
 زمانہ عہد میں اس کے ہے محور ارایش
 درق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
 کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
 بنا ہے عیش تجل حسین خاں کے لیے
 کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے
 بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لیے
 بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
 سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
 صلاے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے



منقبت حیدری

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
مستی باد صبا سے ہے بہ عرض سبزہ
سبز ہے جامِ زمرہ کی طرح داغ پلنگ
مستی ابر سے کچیں طرب ہے حسرت
کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل
سوئے ہے فیض ہوا صورت مژگاں یتیم
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ انداز ہلال
کف ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
میکدے میں ہو اگر آرزوے گل چینی
موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدہ غنچہ باغ
کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر
لعل سے کی ہے پے زمزمہ مدحت شاہ
وہ شہنشاہ کہ جس کے پے تعمیر سرا
فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور
سبزہ نہ چمن و یک خط پشت لب بام
داں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاش

سایہ لالہ بے داغ سوید اے بہار
ریزہ شیشہ مے جوہرا تیغ کہسار
تازہ ہے ریشہ نارج صفت روئے شرار
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
راہ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار
سرنوشت دو جہاں ابر بہ یک سطر غبار
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار
بھول جا یک قدح بادہ بہ طاق گلزار
گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار
سبز مثل خط نوخیز ہو خط پرکار
طوطی سبزہ کہسار نے پیدا منقار
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
رشیہ فیض ازل ساز طناب معمار
رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار
وہ رہے مروحہ بال پری سے بیزار

کاک صحراے نجف جوہر میر عرفا چشم نقش قدم آئینہ بخت بیدار
ذره اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلب مستی نا عرض خمیازہ ایجاد ہے بہ موج غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
تیری اولاد کے غم سے ہے بروے گردوں
ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
مدح میں تیری نہاں زمزمہ نعتِ نبیؐ
جوہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر
مردمک سے ہو عزا خانہ اقبال کی نگاہ
دشمن آلِ نبیؐ کو بہ طرب خانہ دہر
دل پروانہ چراغاں پر بلبل گلزار
ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار
سلک اختر میں مہ نو مژدہ گوہر بار
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار
یک طرف نازد مرثگان و دگر سو غم خار
خاک در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
عرض خمیازہ سیلاب ہو طاق دیوار

دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پرتو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار



فی المنقبت

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
 بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
 ہرزہ ہے نغمہ زیرو بم ہستی و عدم
 نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت
 لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم!
 مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم
 عشق، بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
 کوہکن، گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
 کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز!
 سامع زمزمہ اہل جہاں ہوں لیکن
 کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذ اباللہ
 نقش لاحول لکھ اے خلمہ ہندیاں تحریر
 مظہر فیض خدا جان و دل ختم مرسل
 ہو وہ سرمایہ ایجاد جہاں گرم خرام
 جلوہ پرداز ہو نقش قدم اس کا جس جا
 نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کر رہے
 ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں
 بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
 لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین
 سخن حق ہمہ پیانہ ذوق تحسین
 درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
 صورت نقش قدم خاک بہ فرق تمکین
 وصل ز نگار رخ آئینہ حسن یقین
 بیستون، آئینہ خواب گران شیریں
 کس نے پایا اثر نالہ دلہائے حزیں!
 نہ سرو برگ ستایش نہ دماغ نفیس
 یک قلم خارج آداب وقار و تمکین
 یا علی عرض کراے فطرت و سواس قرین
 قبلہ آل نبی کعبہ ایجاد یقین
 ہر کف خاک ہے واں گردہ تصویر زین
 وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی ائیں
 ابداً پشت فلک خم شدہ ناز زین

فیض خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوا ہے سدا
 برش تنغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
 کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 جاں پناہ! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
 جسم اطہر کو ترے دوش پیہر منبر
 کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
 آستان پر ہے ترے جوہر آئینہ سنگ
 تیرے در کے لیے اسباب نثار آمادہ
 تیری مدحت کے لیے ہیندل جاں کام وزباں
 کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا

بوے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں
 قطع ہو جائے نہ سر رشتہ ایجاد کہیں
 رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانہ چیں
 وصی ختم رسل تو ہے بہ فتوای یقین
 نام نامی کو ترے ناصیہ عرش نلگیں
 شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
 رقم بندگی حضرت جبریل امیں
 خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
 تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جہیں
 کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں!

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
 شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
 دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول
 غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
 طبع کو الفت دلدل میں سرگرمی شوق
 دل الفت نسب و سینہ تو حید فضا
 کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
 ہے ترے حوصلہ فضل پہ از بسکہ یقین
 کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آ میں
 کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جہیں
 نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزریں

صرف اعدا اثر شعلہ و دود دوزخ
 وقف احباب گل و سنبل و فردوس بریں



مدح شاہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
مرحبا اے سرور خاص خواص!
عذر میں تین دن نہ آنے کے
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ!
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
ماہ بن ، ماہتاب بن ، میں کون!

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
یہی انداز اور یہی اندام
بندہ عاجز ہے گردش ایام!
آسمان نے بچھا رکھا تھا دام
حبذا اے نشاط عام عوام!
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
صبح جو جاوے اور آوے شام
تیرا آغاز اور ترا انجام
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام؟
ایک ہی ہے امید گاہ انام
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟
تب کہا ہے بطرز استفہام
قرب ہر روزہ بر سبیل دوام
جز بہ تقریب عید ماہ صیام؟
پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دے کیا کام
ہے مجھے آرزو ہے بخشش خاص گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فر فرورغ کیا نہ دے گا مجھے مے گلنام؟

ق

جب کہ چودہ منازل فلکی کر چکے قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا

توسن طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
بوسہ کیسا ، یہی غنیمت ہے
کعبے میں جا بجائیں گے ناتوس
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام؟

کہ چکا میں تو سب کچھ اب تو، کہ
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ
شہسوار طریقہ انصاف
جس کا ہر فعل صورت اعجاز
بزم میں میزبان قیصر و جم
اے ترا لطف زندگی افزا
چشم بد دور خسروانہ شکوہ!
اے پری چہرہ پیک تیز خرام!
ہیں ہ و مہر و زہرہ و بہرام؟
نام شہنشاہ بلند مقام
مظہر ذوالجلال و الاکرام
نو بہار حدیقہ اسلام
جس کا ہر قول معنی الہام
رزم میں استاد رستم و سام
اے ترا عہد فرخی فرجام
لوحش اللہ عارفانہ کلام!

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم جرہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارث ملک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے گیود و گو درز و بیڑن و رہام

ق

مرحبا موشگافی ناؤک! آفریں آبداری صمصام
تیر کو تیرے تیر غیر ہدف تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گراں جسد کی صدا تیرے رخس سبک عنان کا خرام

ق

فن صورت گری میں تیرا گزر گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سروتن سے کیوں نمایاں ہو صورت ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام
 اور ان اوراق میں بہ کلک قضا مجملہ مندرج ہائے احکام
 لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
 آسمان کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گرد نیلی فام
 حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلف کو دام
 آتش و آب و باد و خاک نے لی وضع سوز و غم و رم و آرام
 مہر رخشاں کا نام خسرو روز ماہ تاباں کا اسم شہنہ شام
 تیری توقع سلطنت کا بھی دی بدستور صورت ارقام
 کاتب حکم نے بہ موجب حکم اس رقم کو دیا طراز دوام

ہے ازل سے روائی آغاز
 ہو ابد تک رسائی انجام



مدح شاہ

صمّدم دروازہ خاور کھلا مہر عالمتاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانب مشرق نظر اک نگار آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب رد سحر بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساتی نے صبحی کے لیے رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا
بزم سلطانی ہوئی آراستہ کعبہ امن و اماں کا در کھلا
تاج زریں مہر تاباں سے سوا خسرو آفاق کے منہ پر کھلا
شاہ روشن دل بہادر شہ ، کہ ہے راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورت تکوین میں مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے عقدہ احکام پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

تو سن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
 نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب
 مجھ پہ فیض تربیت سے شاد کے
 لاکھ عقدہ دل میں تھے لیکن ہر ایک
 تھا دل وابستہ قفل بے کلید
 باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار
 ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس
 لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
 ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے یار کا دروازہ پاویں گر کھلا
 ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
 واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
 ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
 مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ رہوہ میں پردہ رہبر کھلا
 سوز دل کا کیا کرے باران اشک آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
 نامے کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
 دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی
 ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
 خامے نے پائی طبیعت سے مدد بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
 مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ یاں عرض سے رتبہ جوہر کھلا
 مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا رایت لشکر کھلا
 بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایہ منبر کھلا
 سکہ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروے زر کھلا
 شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب آل سعی اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کی مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں دادر کھلا
فکر اچھی پر ستائش ناتمام عجز اعجاز ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خط لوح ازل تم پہ اے خاتان نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تک
ہے طلسم روز و شب کا ذر کھلا!



درصفت انہ

مثنوی

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز
خامے کا صنفے پر رواں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کی لکھیے؟
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
آم کا کون مرد میداں ہے
تکا کے جی میں کیوں رہے ارماں
آم کے آگے پیش جاوے خاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے!
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار،
اور دوڑائیے قیاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر

کیوں نہ کھولے در خزینہ راز
شاخ گل کا ہے گلفشان ہونا
نکتہ ہاے خرد فر لکھیے!
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے
آئے یہ گوے اور یہ میداں
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
بادۂ ناب بن گیا انگور
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے!
جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
کوہکن باوجود غمگینی
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
کہ دواخانہ ازل میں مگر

آتش گل پہ قد کا ہے قوام
یا یہ ہو گا کہ فرط رافت سے
انگیں کے بہ حکم رب الناس
یا لگا کر خضر نے شاخ نبات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
تا ترنج زر ایک خسرو پاس
آم کو دیکھتا اگر اک بار
رونق کارگاہ برگ و نوا
رہو راہ خلد کا توشہ
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
خاص کر وہ آم جو نہ ارزاں ہو
وہ کہ ہے والی ولایت عہد
فخر دیں عز شان و جاہ جلال
کارفرمائے دین و دولت و بخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے

شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
باغبانوں نے باغ جنت سے
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس
مدتوں تک دیا ہے آب حیات
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
پھینک دیتا طلاے دست افشار
نازش دودمان آب و ہوا
طوبی رسدرہ کا جگر گوشہ
ناز پروردہ بہار ہے آم
نو بر نخل باغ سلطان ہو
عدل سے اس کی ہے حمایت عہد
زینت طینت و جمال کمال
چہرہ آراے تاج و مسند و تخت
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

ق

اے مفیض وجود سایہ و نور! جب تلک ہے نمود سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو وارث گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھو
اور غالب پہ مہربان رکھو



قطعات

بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر
پاؤ سے تیرے ملے فراق ارادت اور نگ
تیرا اندازِ سخن شانہ زلف الہام
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطہ قرب کلیم
بہ سخن اوجِ دہ مرتبہ معنی و لفظ
تا، ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی تو فیر
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہن
تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید
بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشید اوقات میں گانٹھ
پیش دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم
درِ معنی سے مرا صفحہ نقا کی ڈاڑھی
فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح

اے جاندارِ کرم شیوہ بے شبہ و عدیل
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکیل
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے دنیا میں بچھا ماندہ بذلِ خلیل
بہ کرم داغ نہ ناصیہ قلزم و نیل
تا، ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقیل
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری بخشش مرے انجام مقاصد کی کفیل
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل
کششِ دم نہیں بے ضابطہ جرّ ثقیل
غم گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلہ کون و مکاں ، خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبہ امن و اماں ، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟



گئے وہ دن کہ نادانستہ ، غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں ”کیوں ہم نہ کہتے تھے“



کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہاے ہاے
وہ سبزہ زار ہاے مٹرا کہ ہے غضب! وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہاے ہاے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حُفِ نظر طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہاے ہاے

وہ میوہ ہاے تازہ و شیریں کہ ، واہ واہ

وہ بادہ ہاے تاب گوارا کہ ہاے ہاے



چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
خامہ انگشت بہ دندان کہ اسے کیا لکھیے
مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھیے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
خاتم دست سلیمان کے مشابہ لکھیے
اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے
حجر اسود دیوار حرم کیجیے فرض
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
کیوں اسے قفل در گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیے
کیوں اسے تلمۂ پیراہن لیلی لکھیے

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
حرز بازوے شکرخانِ خود آرا کہیے
داغ طرف جگر عاشق شیدا کہیے
سر پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
خال مشکیں رخ دلکش لیلی کہیے
نافہ آہوے بیاباں ختن کا کہیے
رنگ میں سبزہ نوخیز میجا کہیے
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے
کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہیے
کیوں اسے مردک دیدہ عنقا کہیے؟
کیوں اسے نقشِ پے ناتۂ سلمی کہیے

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجیے فرض

اور اس چکنی سپادی کو سویدا کہیے



نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدمؑ یہ بیسنی روٹی



خوش ہوا ہے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
کیا ہی اس چاند کے کھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے ہے پر اے طرف کاہ
ناو بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
جی میں اترا نین نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
رخ روشن کی دمک ، گوہر غلتیاں کی چمک
تار ریشم کا نہیں ، ہے یہ رگ ابر بہار

باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ور نہ کیوں لائے ہین کشتی میں لگا کر سہرا
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
لائے تاب گراں باری گوہر سہرا؟

ہم سخن فہم ہیں ، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا



بیان مصنف

منظور ہے گزارش احوال واقعی سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری آزادہ درد ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں استادِ شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال؟ جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاء قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں

اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے مانا ک جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے یہ تاب ، یہ مجال ، یہ طاقت نہیں مجھے سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے جز انبساطِ خاطر حضرت نہیں مجھے دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے سودا نہیں جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب ، خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے



مدح نصرت الملک

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں
نخستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سردست
ہاتھ میں تیرے رہے تو سن دولت کی عنایاں
تو سکندر ہے مرا، فخر ہے ملنا تیرا
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟
رونق بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
نسبت اک گو نہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زہار
غالبِ خاک نشین اہل خرابات سے ہے



چهار شنبہ آخر ماہ صفر

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشکبو، کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح پادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرد مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے

لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند



درمدح شاہ

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہان دار
جو عقدہ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
ممکن ہے کرے خضر، سکندر سے ترا ذکر؟
آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا
ہے نقش مریدی ترا فرمان الہی
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
تو وا کرے اس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
گر لب کو نہ دے چشمہ حیواں سے طہارت
ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت
ہے داغ غلامی ترا توقع امارت

تو آب سے گر سب کرے طاقت سیلاں
 تو آگ سے گرد فغ کرے تاب شرارت
 ڈھونڈے نہ ملے موجہ دریا میں روانی
 باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت
 ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں تو غل
 ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
 کیونکر نہ کروں مدح کو یں ختم دعا پر
 قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت
 نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
 نظارگی صنعت حق اہل بصارت

تجھ کو شرف مہر جہانتاب مبارک!
 غالب کو ترے عقبہ عالی کی زیارت!



روزہ

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے؟



گزارش مصنف بہ حضور شاہ

اے شہنشاہ آسمان اورنگ اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں خانہ زاد اور مرید اور مداح
بارے نوکر بھی ہو گیا ، صد شکر نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
رات کو آگ اور دن کو دھوپ! آگ تاپے کہاں تلک انساں

اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
ہوئی میری وہ گرمی بازار
روشناس ثوابت و سیار
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
بادشہ کا غلام کار گزار
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
مدد عاے ضروری الاظہار
ذوقِ آرائش سرو دستار
تا نہ دے بادِ ز مہرِ آزار
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی! و قتا رہنا عذاب النار!
 میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنjar
 رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
 مجھ دیکھو تو ہوں بہ قید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار!
 بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
 میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے ساہوکار
 آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغمہ گوے خوش گفتار
 رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں میری تیغ جوہر دار
 بزم کا التزام گر کچے ہے قلم میری ابر گوہر بار
 ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
 آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار؟
 میری تنخواہ کچے ماہ بہ ماہ تا ، نہ مجھ کو زندگی دشوار
 ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام: شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
 ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار



سیدہ گلیم ہوں ، لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے



سہل تھا سہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دل مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل ، تین تدبیریں یہ سب کے دن ہوئے؟



خستہ انجمن طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی ”محفوظ“



ہوئی جب میرز جعفر کی شادی
ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے : ”تاریخ اس کی کیا ہے“
تو بولا : ”انشرح جشن جمشید“

﴿۱۲۷۰ھ﴾



گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بھم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں!



رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم
اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال!



شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرغم تھا



آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال
ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال!



دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی
بیتابی رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فردن اے تجلی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی!



ہے خلقِ حسدِ قماش لڑنے کے لیے
وحشتِ کدہٗ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہا بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے



دل سخت نرشد ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا



دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سوتا سو گند ہو گیا ہے غالب



مشکل ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل و گر گویم مشکل



بھیجی ہے جو مجھ شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال



ہیں شہ میں صفات ذوالجلال باہم
آثار جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم



حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کے افزائش اعداد کرے



اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا



کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرستش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں!



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے ، اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے



سامانِ خورد خواب کہا سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے غالب ! لیکن
نہ خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟



ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

